ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

LINGUISTIC FORMATIONS IN THE POETRY OF NASIR KAZMI

ناصر کاظمی کی شاعری میں لسانی تشکیلات

Dr. Muhammad Arif
(Associate Professor, HOD Urdu; Ibadat International University, Islamabad)
Noreen Begum (Lecturer Urdu, University of Kotli. Azad Jammu & Kashmir)

ڈاکٹر محمد عارف (ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو، عبادت انٹر نیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد)
نورین بیگم (لیکچرار شعبہ اردو، یونیورسٹی آف کوٹلی، آزاد جموں و کشمیر)

Abstract

The linguistic architecture of modern Urdu poetry attained a profound aesthetic and intellectual maturity in the poetic universe of Nasir Kazmi, whose verse transformed simplicity into a deeply evocative artistic experience. Emerging from the civilizational trauma of the Partition of the Indian subcontinent, Nasir Kazmi reconstructed the classical idiom of the Urdu ghazal through a language marked by silence, inwardness, symbolic resonance, and subdued musicality. This research article critically investigates the linguistic formations in his poetry through the theoretical frameworks of stylistics, semantics, phonetics, symbolism, and structural poetics.

The study reveals that Nasir Kazmi did not merely inherit the classical tradition—particularly the melancholic and emotionally textured diction of Mir Taqi Mir—but reinterpreted it in accordance with the fractured consciousness, existential solitude, and spiritual displacement of the modern age. His poetic language embodies a rare fusion of colloquial ease and metaphysical depth, where ordinary words transcend their lexical meanings and evolve into symbols of memory, migration, loneliness, loss, and civilizational decay. The article further demonstrates how his subtle syntactic economy, soft phonetic patterns, sensory imagery, and suggestive symbolism create a meditative poetic atmosphere in which silence itself becomes expressive.

Through close textual analysis of selected verses, the research highlights Nasir Kazmi's extraordinary linguistic consciousness and establishes his poetry as a seminal contribution to the evolution of modern Urdu poetics. His artistic achievement lies in liberating Urdu ghazal from rhetorical ornamentation and restoring to it an intimate, humane, and spiritually resonant voice. Ultimately, the article argues that Nasir Kazmi's poetic language represents not merely a stylistic innovation but a quiet aesthetic revolution that reshaped the sensibility, texture, and expressive possibilities of twentieth-century Urdu poetry.

Keywords:

Nasir Kazmi, Linguistic Formations, Urdu Stylistics, Modern Urdu Ghazal, Symbolism, Poetic Language, Phonetic Aesthetics, Sensory Imagery, Existential Poetics, Mir Taqi Mir, Modernism in Urdu Literature, Partition Literature

---

اردو شاعری کی تاریخ دراصل زبان، تہذیب، احساس اور جمالیاتی شعور کے ارتقا کی تاریخ ہے۔ ہر عہد کا شاعر اپنے زمانے کے فکری، تہذیبی اور نفسیاتی تجربات کو زبان کے نئے سانچوں میں ڈھال کر ادب کو تازہ معنویت عطا کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی زبان کبھی جامد نہیں رہی بلکہ مسلسل تغیر، ارتقا اور تخلیقی تشکیل کے مراحل سے گزرتی رہی ہے۔ کلاسیکی دور میں میر تقی میر، سودا، درد اور غالب نے اردو زبان کو داخلی سوز، تہذیبی وقار اور فکری گہرائی عطا کی، جبکہ بیسویں صدی میں جدید حسیت، وجودی بحران، ہجرت، شہری تنہائی اور تہذیبی شکست نے اردو شاعری کی لسانی ساخت کو نئے زاویے عطا کیے۔

بیسویں صدی خصوصاً تقسیمِ ہند کے بعد اردو ادب میں جو تہذیبی بحران پیدا ہوا، اس نے شعری اظہار کی پوری روایت کو متاثر کیا۔ ہجرت، اجڑنے، بے وطنی، شناخت کے بحران اور داخلی تنہائی کے تجربات نے اردو غزل کے مزاج کو تبدیل کر دیا۔ اس دور میں بعض شعرا نے زبان کو تجرید اور ابہام کی سطح تک لے جا کر اظہار کے نئے امکانات تلاش کیے، جبکہ بعض شعرا نے کلاسیکی روایت سے وابستگی برقرار رکھتے ہوئے جدید تجربات کو سادہ مگر تہہ دار زبان میں پیش کیا۔ ناصر کاظمی اسی دوسرے رویّے کے نمائندہ شاعر ہیں۔

ناصر کاظمی نے اردو غزل کی زبان کو غیر ضروری لفظی آرائش، خطیبانہ اسلوب اور تصنع سے محفوظ رکھتے ہوئے ایک ایسا داخلی، نرم اور مدھم لہجہ عطا کیا جو جدید انسان کے وجودی کرب کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کے ہاں زبان محض ابلاغ کا وسیلہ نہیں بلکہ احساس کی ایک لطیف اور تہہ دار تشکیل ہے۔ ان کی شاعری میں لفظ اپنے لغوی مفہوم سے آگے بڑھ کر داخلی تجربے، تہذیبی یادداشت، تنہائی، ہجرت اور روحانی شکست کی علامت بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار اپنی ظاہری سادگی کے باوجود گہری جمالیاتی تاثیر رکھتے ہیں۔

ناصر کاظمی 8 دسمبر 1925ء کو انبالہ میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد ہجرت کر کے لاہور آئے۔ ہجرت کا یہی تجربہ ان کی شاعری کا بنیادی داخلی حوالہ بن گیا۔ ان کے شعری کینوس پر یاد، خاموشی، اجڑاؤ، تنہائی، رات، بارش، اداسی اور ہوا کے جو مدھم رنگ دکھائی دیتے ہیں، وہ دراصل اسی تہذیبی سانحے کی بازگشت ہیں۔

ناصر کاظمی کے اہم شعری مجموعے درج ذیل ہیں:

۱۔ برگِ نے

۲۔ دیوان

۳۔ پہلی بارش

۴۔ نشیب

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق:

"ناصر کاظمی کی شاعری تقسیمِ ہند کے بعد پیدا ہونے والے تہذیبی خلا اور داخلی کرب کی شاعری ہے، لیکن اس کا اظہار چیخ و پکار کے بجائے دھیمے اور نرم لہجے میں ہوتا ہے۔" (۱)

ناصر کاظمی کی شاعری اردو غزل کی لسانی روایت میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ ان کے ہاں سادگی محض سہل نگاری نہیں بلکہ ایک شعوری جمالیاتی رویّہ ہے۔ انہوں نے عام بول چال کے الفاظ، روزمرہ کی تراکیب اور مانوس علامتوں کے ذریعے ایسی تہہ دار معنویت پیدا کی جس نے اردو غزل کو ایک نیا اسلوب عطا کیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

"ناصر کاظمی کی شاعری کا اصل حسن اس کی خاموش موسیقیت اور داخلی لہجے میں پوشیدہ ہے۔ ان کے ہاں زبان چیختی نہیں بلکہ دھیرے دھیرے قاری کے احساس میں اترتی ہے۔" (۲)

شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"ناصر کاظمی نے اردو غزل کی زبان کو نہایت سادگی کے ساتھ ایک نئی معنوی وسعت عطا کی۔ ان کے ہاں لفظ اپنی عام حیثیت میں بھی غیر معمولی جمالیاتی قوت رکھتا ہے۔" (۳)

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"شاعری میں زبان اپنے ابلاغی وظیفے سے آگے بڑھ کر جمالیاتی نظام میں تبدیل ہو جاتی ہے۔" (۴)

گوپی چند نارنگ کی یہ رائے اردو تنقید اور جدید لسانی و ساختیاتی مباحث کے تناظر میں نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ یعنی شاعری میں زبان محض معلومات یا خیالات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں رہتی بلکہ وہ حسن، احساس، موسیقیت، علامت، تاثر اور داخلی کیفیت کی تخلیق کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ عام یا روزمرہ زبان کا بنیادی مقصد کسی بات کو واضح طور پر بیان کرنا ہوتا ہے، لیکن شعری زبان کا مقصد صرف "کہنا" نہیں بلکہ "محسوس کروانا" بھی ہوتا ہے۔

روزمرہ زندگی میں انسان زبان کو ابلاغ کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "رات بہت تاریک ہے"، تو یہ ایک سادہ اطلاع یا بیان ہے۔
لیکن جب شاعر کہتا ہے:

"رات بھر تنہا رہا
درد کا مارا ہوا"

تو یہاں "رات" محض وقت کا نام نہیں رہتی بلکہ تنہائی، اداسی، داخلی کرب اور روحانی شکست کی علامت بن جاتی ہے۔ یعنی لفظ اپنے لغوی معنی سے آگے بڑھ کر ایک جمالیاتی اور علامتی نظام تشکیل دیتا ہے۔

گوپی چند نارنگ دراصل یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ شاعری میں الفاظ کی اہمیت صرف معنی تک محدود نہیں ہوتی بلکہ ان کی صوتیات، آہنگ، علامتی قوت، تہذیبی پس منظر اور جذباتی تاثیر بھی اہم ہوتی ہے۔ شاعر جب الفاظ کو مخصوص ترتیب، صوتی آہنگ اور علامتی ربط کے ساتھ استعمال کرتا ہے تو زبان ایک فنکارانہ تجربے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کو صرف "پیغام" نہیں بلکہ "تجربہ" کہا جاتا ہے۔

ناصر کاظمی کی شاعری اس نظریے کی بہترین مثال ہے۔ ان کے ہاں الفاظ محض اشیا یا مظاہر نہیں رہتے بلکہ داخلی شکست کے استعارے بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

"ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اداسی بال کھولے سو رہی ہے"

اس شعر میں "اداسی" ایک مجرد کیفیت ہونے کے باوجود ایک جیتی جاگتی شبیہ بن جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں زبان اپنے عام ابلاغی کردار سے بلند ہو کر جمالیاتی نظام میں تبدیل ہوتی ہے۔

گوپی چند کے مذکورہ اقتباس کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ شاعری میں زبان کی صوتی اور موسیقائی حیثیت بھی اہم ہو جاتی ہے۔ شاعر الفاظ کو اس انداز سے ترتیب دیتا ہے کہ ان کی آواز، لے، نرمی یا سختی خود معنی پیدا کرنے لگتی ہے۔ ناصر کاظمی کے اشعار میں نرم حروف، مختصر بحریں اور دھیمی موسیقیت قاری کے احساس میں ایک مدھم اداسی پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح زبان صرف معنی نہیں دیتی بلکہ ایک مکمل جمالیاتی فضا تخلیق کرتی ہے۔

لہٰذا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاعری میں زبان معلومات پہنچانے کا سادہ وسیلہ نہیں رہتی بلکہ حسن، احساس، علامت، موسیقیت اور داخلی تجربے کی تخلیقی تشکیل بن جاتی ہے۔ یہی وصف شاعری کو عام نثر یا روزمرہ گفتگو سے ممتاز کرتا ہے۔

لسانی تشکیلات سے مراد زبان کی وہ تخلیقی ساخت ہے جس کے ذریعے شاعر اپنے احساسات، تجربات اور خیالات کو مخصوص اسلوب، صوتیات، علامتوں، تراکیب اور نحوی بندشوں کے ذریعے جمالیاتی پیکر عطا کرتا ہے۔ ساختیات کے بانی سوسئیر کے مطابق زبان علامات کے ایک منظم نظام کا نام ہے۔ شاعری میں یہی علامات نئے معنوی امکانات پیدا کرتی ہیں۔ رومن جیکبسن نے شاعری کو "زبان کا جمالیاتی استعمال" قرار دیا ہے۔

شاعری میں لفظ اپنی لغوی سطح سے بلند ہو کر تہذیبی، نفسیاتی اور جمالیاتی مفاہیم اختیار کر لیتا ہے۔ جدید اردو شاعری میں یہی لسانی شعور نئے شعری جمالیات کی تشکیل کرتا ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری اسی لسانی شعور کی بہترین مثال ہے۔

ناصر کاظمی کے ہاں زبان نہ تو محض علامتی ابہام کا شکار ہے اور نہ ہی خطیبانہ اظہار کی اسیر؛ بلکہ ان کے ہاں لفظ ایک خاموش داخلی ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں صوتیات، معنیات، علامت، حسیاتی پیکر اور نحوی اختصار مل کر ایک ایسی شعری فضا تشکیل دیتے ہیں جس میں خاموشی بھی بولتی محسوس ہوتی ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ مختلف لسانی ادوار سے عبارت ہے۔ کلاسیکی شعرا کے ہاں زبان تہذیبی شائستگی اور داخلی سوز کی حامل تھی۔ میر تقی میر کے ہاں سادگی، درد اور روزمرہ کی زبان ایک نئے جمالیاتی آہنگ کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ غالب نے زبان کو فکری پیچیدگی اور فلسفیانہ گہرائی عطا کی۔ حالی اور اقبال نے اردو شاعری کو فکری اور قومی شعور سے وابستہ کیا، جبکہ جدید شعرا نے داخلی تجربے اور وجودی کرب کے اظہار کے لیے نئی لسانی تراکیب وضع کیں۔

ناصر کاظمی اسی جدید لسانی روایت کے اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہوئے جدید انسان کی تنہائی، بے وطنی اور روحانی شکست کو نہایت نرم اور مدھم زبان میں بیان کیا۔ ان کے ہاں روزمرہ کی زبان، علامتی اظہار، صوتی نغمگی اور داخلی سوز ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک منفرد شعری جمالیات تشکیل دیتے ہیں۔

ناصر کاظمی کی شعری زبان کی سب سے اہم خصوصیت اس کی سادگی ہے۔ انہوں نے ثقیل فارسی تراکیب یا پیچیدہ لفظیات کے بجائے عام بول چال کی زبان کو شاعری کا حصہ بنایا۔ ان کے ہاں مصنوعی پن یا خطیبانہ انداز نہیں ملتا بلکہ ایک فطری روانی اور داخلی سچائی موجود ہے۔

مثلاً:

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا (۵)

اس شعر میں نہایت سادہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں، لیکن ان کے اندر انسانی فنا، وقت کے تسلسل اور وجودی احساس کی گہری معنویت پوشیدہ ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق:

"ناصر کاظمی نے روزمرہ کی زبان کو اس طرح شعری آہنگ عطا کیا کہ عام لفظ بھی غیر معمولی معنوی تاثیر پیدا کرنے لگے۔" (۶)

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

شمس الرحمٰن فاروقی کا درج بالا قول ناصر کاظمی کی شعری عظمت اور ان کے لسانی اسلوب کی نہایت جامع اور بامعنی توضیح ہے۔ اس اقتباس سے مراد یہ ہے کہ ناصر کاظمی نے اردو غزل میں ایسے الفاظ اور تراکیب استعمال کیں جو عام زندگی، روزمرہ گفتگو اور سادہ انسانی اظہار کا حصہ تھے، لیکن انہوں نے ان معمولی الفاظ کو اپنے مخصوص شعری آہنگ، داخلی موسیقیت، علامتی ربط اور جذباتی فضا کے ذریعے اس قدر مؤثر بنا دیا کہ وہ گہری معنویت اور جمالیاتی تاثیر کے حامل بن گئے۔

اردو شاعری خصوصاً کلاسیکی غزل میں فارسی آمیز، ثقیل اور بلند آہنگ زبان کا رجحان موجود رہا ہے، مگر ناصر کاظمی نے اس روایت سے ہٹ کر سادہ، مانوس اور روزمرہ زبان کو اپنی شاعری کا بنیادی وسیلہ بنایا۔ تاہم ان کی سادگی محض سہل نگاری نہیں بلکہ ایک شعوری اور فنکارانہ سادگی ہے۔ ان کے ہاں عام لفظ اپنے لغوی معنی سے آگے بڑھ کر داخلی کیفیت، یاد، تنہائی، ہجرت اور روحانی کرب کی علامت بن جاتا ہے۔

اس اقتباس کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ناصر کاظمی کے ہاں زبان تصنع، خطابت اور مصنوعی آرائش سے پاک ہے۔ ان کے اشعار میں گفتگو کا سا انداز ملتا ہے، لیکن یہی سادہ گفتگو جب شعری تجربے سے گزرتی ہے تو ایک جمالیاتی کیفیت اختیار کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر:

"کیا دن تھے جب نظر میں خزاں بھی بہار تھی
یوں اپنا گھر بہار میں ویراں نہ تھا کبھی" (۷)

یہاں بھی تمام الفاظ عام فہم ہیں، مگر "بہار" اور "خزاں" کا تضاد مل کر ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جو اداسی اور یاد کے امتزاج کو نہایت لطیف انداز میں پیش کرتے ہیں۔

در حقیقت ناصر کاظمی کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے زبان کو مصنوعی پیچیدگی سے آزاد کر کے انسانی احساس کے قریب تر کر دیا۔ ان کے ہاں شاعری بلند آہنگ خطابت نہیں بلکہ دھیرے دھیرے دل میں اترنے والی سرگوشی بن جاتی ہے۔ وہ عام لفظوں سے غیر معمولی جمالیاتی تجربہ پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے قاری کو الفاظ کی بناوٹ سے زیادہ ان کے اندر چھپی ہوئی خاموش اداسی اور داخلی ارتعاش محسوس ہوتا ہے۔

لہٰذا فاروقی کے اس اقتباس کا مفہوم یہ ہے کہ ناصر کاظمی نے روزمرہ کی سادہ زبان کو فنکارانہ ترتیب، داخلی موسیقیت، نرم صوتیات اور علامتی معنویت کے ذریعے اس مقام تک پہنچا دیا جہاں عام الفاظ بھی غیر معمولی جمالیاتی اور جذباتی تاثیر پیدا کرنے لگے۔ یہی وصف انہیں جدید اردو غزل کے منفرد اور اہم شعرا میں ممتاز کرتا ہے۔

ناصر کاظمی کی شاعری میں گفتگو کا ایک فطری انداز ملتا ہے۔ ان کے اشعار تصنع سے پاک اور داخلی تجربے کے قریب محسوس ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر قاری سے براہِ راست ہم کلام ہو۔

مثلاً:

پھر ساون رُت کی پون چلی، تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی، تم یاد آئے (۸)

یہ شعر اپنی سادگی اور روزمرہ کے انداز کی وجہ سے قاری کے احساسات پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔

ناصر کاظمی کی شاعری کی ایک بڑی خصوصیت اس کی نرم صوتیات اور داخلی موسیقیت ہے۔ ان کے ہاں نرم حروف، مختصر بحریں اور دھیمے آہنگ والے الفاظ ایک خاص نغمگی پیدا کرتے ہیں۔

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی (۹)

اس شعر میں "لہر"، "ہوا"، "چلی" اور "ابھی" جیسے الفاظ صوتی سطح پر ایک نرم اور مدھم موسیقی پیدا کرتے ہیں۔ یہی نغمگی ان کی شاعری کے داخلی سوز کو بڑھاتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"ناصر کاظمی کی شاعری میں صوتی آہنگ اور معنوی کیفیت ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہیں کہ شعر گنگنانے لگتا ہے۔" (۱۰)

ناصر کاظمی نے چھوٹی بحروں کو نہایت مہارت سے برتا۔ اس سے ان کی شاعری میں داخلی روانی اور دھیمی موسیقیت پیدا ہوئی۔

یاد ہے اب تک تجھ سے بچھڑنے کی وہ اندھیری شام مجھے
تو خاموش کھڑا تھا لیکن باتیں کرتا تھا کاجل (۱۱)

مختصر بحروں کی وجہ سے شعر میں ایک مسلسل بہاؤ محسوس ہوتا ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

ناصر کاظمی کی شاعری علامتی اظہار سے بھرپور ہے۔ ان کے ہاں "رات"، "چاند"، "خوشبو"، "پرندہ"، "ہوا"، "شجر"، "سایہ" اور "گھر" جیسے الفاظ محض لغوی معنی نہیں رکھتے بلکہ ایک وسیع تہذیبی اور نفسیاتی پس منظر کے حامل ہیں۔

ناصر کے ہاں "رات" تنہائی، ہجرت، ماضی اور داخلی کرب کی علامت ہے۔

رات بھر تنہا رہا
درد کا مارا ہوا (۱۲)

"کنکر" اُن کے ہاں یاد اور بچھڑے ہوئے محبوب کے دکھ کی علامت بن کر سامنے آیا ہے۔

تیری گلی میں سارا دن
دکھ کے کنکر چنتا ہوں (۱۳)

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"ناصر کاظمی کے ہاں علامت ابہام پیدا نہیں کرتی بلکہ داخلی احساس کی تہہ داری کو بڑھاتی ہے۔" (۱۴)

ناصر کاظمی کے ہاں **"شہر ستمگر"** ظلم و بے اعتنائی کی علامت ہے، جبکہ **"پتھر"** محبوب کی سنگ دلی اور محرومیوں کی یاد کا استعارہ ہے۔

درج ذیل شعر میں محرومی کے باوجود وابستگی اور تلخ تجربات کو بھی قیمتی یادگار سمجھنے کا خوبصورت اور معنی خیز اظہار ملتا ہے:

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں (۱۵)

"دھوپ کا کہرا" ایک منفرد اور جدید لسانی ترکیب ہے جو بصری اور نفسیاتی دونوں سطحوں پر اثر پیدا کرتی ہے۔

اسی طرح:

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے (۱۶)

یہاں "اداسی" کو انسانی وجود کی شکل دے کر تجسیم (Personification) کا حسین نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

ناصر کاظمی کے ہاں "دھوپ کی دیوار"، "خالی مکان"، "سرد ہوا"، "سبز شاخ" جیسی تراکیب نہ صرف تصویری کیفیت پیدا کرتی ہیں بلکہ ایک مکمل نفسیاتی فضا بھی تخلیق کرتی ہیں۔

ناصر کاظمی کی لسانی تشکیلات کا ایک اہم پہلو ایجاز و اختصار ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں گہری معنویت پیدا کرتے ہیں۔

اک رُخسار پہ زُلف گری تھی
اک رُخسار پہ چاند کھِلا تھا
ٹھوڑی کے جگمگ شیشے میں
ہونٹوں کا سایہ پڑتا تھا (۱۷)

ان اشعار میں نحوی ساخت نہایت سادہ ہے لیکن داخلی احساسات کی پیچیدگی پوری شدت کے ساتھ منتقل ہوتی ہے۔ پہلے شعر میں بتایا جا رہا ہے کہ ایک رخسار پر زلف کا سایہ ہے جو تاریکی کی علامت ہے، اور دوسرے رخسار پر چاند کی روشنی ہے جو نور اور صفائی کی علامت ہے۔ یہ تضاد حسن کو دو جہتوں میں دکھاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے دوسرے شعر میں ٹھوڑی کے جگمگ شیشے میں ہونٹوں کا سایہ پڑنا ایک آئینگی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شاعر نے حسن کو صرف براہِ راست نہیں بلکہ عکس کے ذریعے بھی دکھایا ہے، جو جمالیاتی گہرائی کو بڑھاتا ہے۔ رخسار، زلف، چاند، ٹھوڑی، شیشہ اور ہونٹ ـــــ یہ سب جزئیات مل کر ایک مکمل جمالیاتی منظر تخلیق کرتے ہیں۔ رخسار پر چاند کا کھلنا حسن کو کائنات سے جوڑ دیتا ہے۔ گویا محبوب کا چہرہ خود ایک کائناتی منظر نامہ ہے۔

ناصر کاظمی کے اشعار میں لفظ کم اور احساس زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری قاری کے ذہن میں دیرپا معنوی بازگشت پیدا کرتی ہے۔

ناصر کاظمی کو "بیسویں صدی کا میر" کہا جاتا ہے۔ ان کے ہاں میر کی طرح سادگی، داخلی کرب اور دھیما لہجہ موجود ہے، تاہم ناصر نے اس روایت کو جدید شہری زندگی، ہجرت اور وجودی تنہائی سے ہم آہنگ کیا۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

میر کا شعر:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

ناصر کا شعر:

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے، آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ (۱۸)

محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

"ناصر کاظمی نے میر کی روایت کو جدید انسان کے احساسِ تنہائی سے ہم آہنگ کر کے اردو غزل کو نئی معنوی جہت عطا کی۔" (۱۹)

محمد حسن عسکری کا یہ قول دراصل ناصر کاظمی کی شعری عظمت، ان کے تہذیبی شعور اور ان کی لسانی انفرادیت کا نہایت گہرا اور بصیرت افروز اعتراف ہے۔ عسکری یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ناصر کاظمی نے میر تقی میر کی روایت کو محض تقلید یا تکرار کے طور پر اختیار نہیں کیا بلکہ اس روایت کو اپنے عہد کے زخمی انسان، اس کی داخلی تنہائی، ہجرت کے کرب اور روحانی بے وطنی کے احساس سے ہم آہنگ کر کے اردو غزل کو ایک نئی معنوی وسعت عطا کی۔

میر کی شاعری میں جو درد، شکستگی، سادگی اور انسانی دل کی خاموش چیخ سنائی دیتی ہے، ناصر کاظمی نے اسی داخلی سوز کو بیسویں صدی کے تہذیبی انتشار کے ساتھ جوڑ دیا۔ میر کے عہد میں اجڑتی ہوئی دہلی، زوال پذیر تہذیب اور عاشق کا ذاتی کرب تھا، مگر ناصر کے عہد میں تقسیم ہند کا اجتماعی سانحہ، ہجرت کی اذیت، شناخت کا بحران اور جدید شہری زندگی کی بے روح تنہائی شامل ہو گئی تھی۔ ناصر نے میر کے دھیمے لہجے کو اپنے زمانے کی اداس فضا میں اس طرح جذب کیا کہ ان کی شاعری ایک خاموش مگر گہری داخلی لرزش بن گئی۔

میر کے ہاں درد ایک ذاتی واردات ہے، جبکہ ناصر کے ہاں یہی درد اجتماعی تہذیبی المیہ بن کر ابھرتا ہے

ناصر کے ہاں تنہائی صرف ایک فرد کی کیفیت نہیں رہتی بلکہ پورے عہد کی شکست خوردگی، اجڑتے ہوئے گھروں اور بکھرتی ہوئی تہذیب کی علامت بن جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میر کے اجڑے ہوئے کوچوں کی بازگشت لاہور کی خاموش گلیوں میں دوبارہ سنائی دینے لگی ہو۔

عسکری کے اس قول کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ناصر کاظمی نے میر کی سادگی کو جدید حسیت سے ہم آہنگ کیا۔ ان کے ہاں الفاظ میں وہی نرم روانی، گفتگو کا سا انداز اور داخلی سوز موجود ہے، لیکن اس کے ساتھ جدید انسان کی بے چینی، اجنبیت اور روحانی تھکن بھی شامل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناصر کی شاعری چیختی نہیں بلکہ خاموشی کے اندر ایک مسلسل ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ ان کے اشعار پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شکستہ دل شخص دھیرے دھیرے اپنی اداسی سناتا جا رہا ہو۔ ان کے نزدیک ناصر کاظمی کی اصل اہمیت یہی ہے کہ انہوں نے کلاسیکی اردو غزل کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جدید زمانے کے روحانی بحران سے ہم آہنگ کیا۔ انہوں نے روایت کو ماضی کا بوجھ نہیں بننے دیا بلکہ اسے زندہ انسانی تجربے میں تبدیل کر دیا۔ ان کے ہاں میر کی اداسی، تقسیم ہند کے بعد کے انسان کی بے وطنی سے مل کر ایک نئے جمالیاتی اور تہذیبی شعور کو جنم دیتی ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ ناصر کاظمی نے میر کے چراغ سے روشنی تو حاصل کی، مگر اس روشنی کو اپنے عہد کی دھند، تنہائی اور خاموش شکستگی کے اندر رکھ کر اردو غزل کو ایک نئی معنوی اور جمالیاتی جہت عطا کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ماضی کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے اور جدید انسان کی تنہا روح کی دھیمی آہ بھی۔

ناصر کاظمی کے ہاں میر کی سی سادگی، دھیما پن اور درد تو موجود ہے، مگر اس کے ساتھ تقسیمِ ہند کے بعد کی تہذیبی شکست اور جدید انسان کی روحانی تنہائی بھی شامل ہو جاتی ہے۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اداسی بال کھولے سو رہی ہے (۲۰)

اس شعر میں ناصر کاظمی نے "اداسی" جیسی تجریدی کیفیت کو مجسم پیکر عطا کیا ہے۔ "بال کھولے سونا" اردو تہذیبی شعور میں سوگ، وحشت اور گہرے دکھ کی علامت ہے۔ "گھر" اور "دیواریں" داخلی تنہائی اور تہذیبی اجڑاؤ کے استعارے ہیں۔

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی (۲۱)

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

اس شعر میں "لہر" داخلی جذبے کی علامت ہے جبکہ "تازہ ہوا" امید، یاد اور روحانی تازگی کی نمائندہ ہے۔ صوتی اعتبار سے "ل"، "ہ"، "و" اور "ی" کی تکرار ایک نرم موسیقیت پیدا کرتی ہے۔

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے
یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اُٹھانے والے کیا ہوئے (۲۲)

درج بالا اشعار میں شاعر نے **استفہامِ انکاری** (سوالیہ انداز) اختیار کر کے ماضی کے مخلص اور خدمت گزار لوگوں کی گمشدگی پر حسرت کا اظہار کیا ہے۔
"اکیلے گھر" اور **"دیا"** علامتی پیکر ہیں؛ "گھر" ویرانی اور تنہائی کا اظہاریہ ہے جبکہ "دیا" روشنی، محبت اور زندگی کی حرارت کا استعارہ ہے۔ دوسرے شعر میں **تضادِ معنوی** پیدا کیا گیا ہے؛ ایک طرف خود کو "زمین کا بوجھ" کہا گیا ہے اور دوسری طرف "زمین کا بوجھ اٹھانے والے" فعال اور باکردار انسانوں کا ذکر ہے۔
سادہ مگر پُراثر زبان، علامت نگاری، تکرارِ لفظ ("زمین") اور دردِ زمانہ کے احساس نے اشعار کی فنی خوبصورتی کو نمایاں کر دیا ہے۔
زیرِ نظر تحقیقی مطالعے سے یہ حقیقت پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ ناصر کاظمی نے اردو غزل کی شعری زبان کو ایک نئی داخلی معنویت، نرم آہنگی اور تہذیبی حساسیت عطا کی۔ ان کی شاعری میں زبان محض اظہار کا وسیلہ نہیں رہتی بلکہ ایک زندہ اور متحرک احساس بن کر قاری کے باطن میں اترتی ہے۔ ناصر کاظمی نے اپنے عہد کے تہذیبی انتشار، ہجرت کے کرب، تنہائی کے احساس اور روحانی شکست کو ایسی دھیمی اور مدھم زبان میں بیان کیا جو شور پیدا نہیں کرتی بلکہ خاموشی کے اندر ایک مسلسل ارتعاش پیدا کرتی ہے۔
ناصر کاظمی کی شعری زبان اپنی بظاہر سادگی کے باوجود نہایت تہہ دار، علامتی اور معنیاتی وسعت کی حامل ہے۔ انہوں نے روزمرہ کے عام الفاظ کو اس فنی مہارت کے ساتھ برتا کہ وہ الفاظ محض لغوی معنی تک محدود نہ رہے بلکہ داخلی کیفیت، تہذیبی یادداشت اور وجودی احساس کی علامت بن گئے۔ "رات"، "چاند"، "ہوا"، "خوشبو"، "سایہ"، "پرندہ" اور "گھر" جیسی علامتیں ان کی شاعری میں مسلسل ابھرتی ہیں اور رفتہ رفتہ ایک مکمل لسانی و جمالیاتی نظام تشکیل دیتی ہیں۔
ناصر کاظمی کی شاعری میں صوتیات محض لفظی حسن نہیں بلکہ معنوی ترسیل کا بنیادی وسیلہ ہیں۔ ان کے ہاں نرم حروف، مختصر بحریں، دھیمی لے اور داخلی موسیقیت مل کر ایک ایسی صوتی فضا پیدا کرتے ہیں جس میں اداسی بھی مترنم محسوس ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں سناٹا بھی بولتا ہے اور خاموشی بھی ایک مکمل جمالیاتی تجربہ بن جاتی ہے۔
ناصر کاظمی نے کلاسیکی اردو روایت خصوصاً میر تقی میر کے داخلی اور درد آشنا لہجے کو جدید عہد کے احساسات سے ہم آہنگ کیا۔ ان کے ہاں میر کی سی سادگی، دھیما پن اور داخلی کرب تو موجود ہے، مگر اس کے ساتھ تقسیمِ ہند کے بعد کی تہذیبی و نفسیاتی شکست کا ایک نیا شعور بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اُن کی شعری زبان میں ایجاز و اختصار ایک غیر معمولی فنی وصف کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں گہرے انسانی تجربات کو اس شدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ شعر اپنے ظاہری اختصار کے باوجود قاری کے ذہن میں طویل معنوی بازگشت پیدا کرتا ہے۔ مزید برآں، یہ کہ ناصر کاظمی نے اردو غزل کو تصنع، خطابت اور غیر ضروری لفظی آرائش سے نجات دلا کر ایک ایسی شعری زبان عطا کی جو داخلی سچائی اور انسانی احساس کے زیادہ قریب ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات کی شدت موجود ہے لیکن اس کا اظہار شور یا چیخ کے بجائے خاموش لہجے میں ہوتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ناصر کاظمی کی شعری زبان اردو غزل کی روایت میں ایک خاموش مگر گہرا انقلاب ہے۔ انہوں نے لفظ کو شور سے نہیں بلکہ خاموشی سے آشنا کیا؛ انہوں نے سادگی کو سطحیت نہیں بننے دیا بلکہ اسے داخلی جمالیات کا استعارہ بنا دیا؛ اور انہوں نے اردو شاعری کو ایک ایسا دھیمہ، مٹیالا اور روحانی لہجہ عطا کیا جس کی بازگشت آج بھی اردو ادب کی فضا میں محسوس کی جا سکتی ہے۔

حوالہ جات

(۱)۔ فرمان فتح پوری، اردو غزل کے اہم موڑ، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، 1997ء، ص:241۔
(۲) ۔ وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1989ء، ص:216۔
(۳)۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز، جلد پنجم، الہٰ آباد: شب خون کتاب گھر، 2004ء، ص:182۔
(۴)۔ گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1993ء، ص:119۔
(۵)۔ ناصر کاظمی، برگِ نے، ہال بازار، امرتسر: آزاد بک ڈپو، 1950ء، ص:116۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

(۶)۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز، جلد پنجم، الہٰ آباد: شب خون کتاب گھر، 2004ء، ص:178۔

(۷) ۔ناصر کاظمی، برگِ نے، ہال بازار، امر تسر: آزاد بک ڈپو، 1950ء، ص:17

(۸)۔ ناصر کاظمی، دیوان، لکھنؤ: مکتبہ دین وادب، 1977ء، ص:15۔

(۹)۔ ناصر کاظمی، پہلی بارش، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1975ء، ص:55۔

(۱۰)۔ انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز پبلشرز، 2010ء، ص:512۔

(۱۱) ۔ناصر کاظمی دیوان، لکھنؤ: مکتبہ دین وادب، 1977ء، ص:31۔

(۱۲)۔ ناصر کاظمی، برگِ نے، لاہور: مکتبہ جدید، 1980ء، ص:74۔

(۱۳) ۔ ناصر کاظمی دیوان، لکھنؤ: مکتبہ دین وادب، 1977ء، ص:29۔

(۱۴)۔ گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1993ء، ص:301۔

(۱۵)۔ ناصر کاظمی دیوان، لکھنؤ: مکتبہ دین وادب، 1977ء، ص:137۔

(۱۶) ۔ناصر کاظمی، برگِ نے، لاہور: مکتبہ جدید، 1980ء، ص:82۔

(۱۷)۔ ناصر کاظمی، پہلی بارش، لاہور: فضلِ حق اینڈ سنز، پبلشر اینڈ پرنٹرز، 1992ء، ص:50۔

(۱۸) ۔ ناصر کاظمی دیوان، لکھنؤ: مکتبہ دین وادب، 1977ء، ص:140۔

(۱۹) ۔محمد حسن عسکری، انسان اور آدمی، لاہور: مکتبہ جدید، 1987ء، ص:156۔

(۲۰) ناصر کاظمی، برگِ نے، لاہور: مکتبہ جدید، 1980ء، ص:82۔

(۲۱) ناصر کاظمی، پہلی بارش، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1975ء، ص:55۔

(۲۲) ناصر کاظمی دیوان، لکھنؤ: مکتبہ دین وادب، 1977ء، ص:144۔

کتابیات

(۱)۔ آغا، وزیر۔ اردو شاعری کا مزاج۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1989ء۔

(۲) ۔ آل احمد سرور، جدید اردو شاعری۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1985ء۔

(۳)۔ انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ۔ لاہور: عزیز پبلشرز، 2010ء۔

(۴)۔ رفیع الدین ہاشمی، اردو غزل کا فکری وفنی ارتقا۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، 2001ء۔

(۵)۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز، جلد پنجم۔ الہٰ آباد: شب خون کتاب گھر، 2004ء۔

(۶)۔ فرمان فتح پوری۔ اردو غزل کے اہم موڑ۔ کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، 1997ء۔

(۷) ۔ گوپی چند نارنگ۔ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔ نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1993ء۔

(۸)۔ محمد حسن عسکری، انسان اور آدمی۔ لاہور: مکتبہ جدید، 1987ء۔

(۹)۔ ممتاز حسین۔ جدید اردو ادب۔ لاہور: مکتبہ کارواں، 1995ء۔

(۱۰)۔ ناصر کاظمی، برگِ نے۔ لاہور: مکتبہ جدید، 1980ء۔

(۱۱) ۔ ناصر کاظمی، پہلی بارش۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1975ء۔

(۱۲)۔ ناصر کاظمی، دیوان۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1986ء۔